رسائل و مسائل

علومِ نفسیات اور چند متفرق مسائل

سوال:- "مجھے آپ کی کتابیں پڑھنے اور آپ سے زبانی گفتگو کرنے سے بے حد فائدہ ہوا ہے اور ہمیشہ آپ کے حق میں دعائے خیر کرتا رہتا ہوں۔ میں آج کل امریکہ میں بالخصوص نفسیاتی علوم اور ذہنی عوارض کے فنِ علاج کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ اور آپ کی اسلامی بصیرت سے استفادہ کرنا چاہتا ہوں۔ میرے سوالات درج ذیل ہیں:

(۱) اسلام میں "نفس" کی کیا تعریف ہے۔ قرآن مجید کی اس آیت کی تشریح کیا ہوگی؟ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا۔ ..... یہ محض ایک حیاتیاتی (بیولاجیکل) محرک ہے یا اس سے زائد کوئی شے ہے۔ آیات کے الفاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مَن کوئی دوسرا وجود ہے جو نفس کو اپنے تحت رکھتا ہے اور اُس پر اثر انداز ہوتا ہے۔ تقویٰ اور فجور کے الہام کیے جانے سے کیا مُراد ہے۔ نفس کو دفن کرنے اور اس کا تزکیہ کرنے کا کیا مطلب ہے۔ نفسِ امّارہ اور نفسِ لوّامہ کی نفسیاتی تعریف کیا ہو سکتی ہے۔ ان آیات و اصطلاحات پر پوری رہنمائی درکار ہے تاکہ ہمیں سوچنے کا مواد فراہم ہو سکے اور وہ اسلام کا ایک فلسفیانہ اور نفسیاتی مدرسۂ فکر بنانے میں مفید ثابت ہو۔

(۲) نفس (MIND)، دماغ (BRAIN) اور جسم کے باہمی تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ یہ تو ظاہر ہے کہ دماغ اور جسم مادّے سے مرکب ہیں اور نفس یا دماغ ایک غیر مادّی چیز ہے۔

(۳) آپ نے غالباً تفہیم اور بعض دوسرے مقامات پر پہلی وحی کی بہت عمدہ کیفیت بیان کی تھی اور یہ نقشہ کھینچا تھا کہ یہ کوئی داخلی SUBJECTIVE تجربہ نہ تھا جس کے لیے

پہلے سے کوشش اور تیاری کی گئی ہو بلکہ دفعتہً خارج سے فرشتے اور وحی کا نزول ہوا تھا جو ایک قطعی غیر متوقع تجربہ تھا اور آنحضورؐ کو اس سے ایک ایسا اضطراب لاحق ہوا تھا جیسا کہ اچانک رونما ہونے والے واقعہ سے ہوتا ہے۔ گیان دھیان، مراقبہ اور وحیٔ نبوت کے مابین واضح خطِ امتیاز یہی ہے کہ نبی کا مشاہدہ بالکل ایک خارجی اور معروضی OBJECTIVE حقیقت سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ غارِ حرا میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے غور و فکر کی حیثیت کیا تھی؟ معترض کہہ سکتا ہے کہ یہ بھی داخلی اور قلبی واردات کے اکتساب کی کوشش ہی تھی۔

(۴) مجھ سے ایک نفسیاتی معالج PSYCHIATRIST نے سوال کیا کہ نبی پر نزولِ وحی کیا اُسی طرح کی چیز نہیں جیسے کہ ایک سائیکوٹک مریض کو بعض صورتیں دکھائی دیتی اور آوازیں سنائی دیتی ہیں (نعوذ باللہ نقلِ کفر کفر نباشد)۔ میں اُسے پوری طرح قائل نہ کر سکا اس لیے آپ سے رہنمائی کا طالب ہوں۔

(۵) آپ نے اسلام کا تصور توحید اور اس کی تاریخ یہ بیان کی ہے کہ ابتدا میں انسان وحدتِ الٰہی کا قائل تھا اور اسے یہی تعلیم دی گئی شرک بعد کی پیداوار ہے مگر تاریخِ ادیان کا موجودہ نظریہ اس کے برعکس ہے۔ وحشی اور جنگلی قبائل کے مشرکانہ توہمات سے اس کی تائید فراہم کی جاتی ہے۔ اس استدلال کی تردید کیسے کی جا سکتی ہے؟

(۶) اسلام جرائم کے ارتکاب میں مجرم کو ایک صحیح الدماغ اور صاحبِ ارادہ فرد قرار دے کر اُسے قانوناً و اخلاقاً اپنے فعل کا پوری طرح ذمہ دار قرار دیتا ہے مگر ذہنی و نفسی عوارض کے جدید معالج اور ماہرین جنہیں PSYCHIATRIST کہا جاتا ہے وہ سنگین اور گھناؤنے جرائم کرنے والوں کو بھی ذہنی مریض کہہ دیتے ہیں اور انہیں جرائم کے شعوری و ارادی ارتکاب سے بری الذمہ قرار دے دیتے ہیں۔ یہ نظریہ اسلامی نقطۂ نظر سے کہاں تک صحیح اور قابلِ تسلیم ہے؟

(۷) کیا انسانوں کے ساتھ جن بھی خلافتِ ارضی میں شریک ہیں۔ کیا ان کی نفسیات بھی انسانی

نفسیات کے مماثل ہیں۔ یہ جو مشہور ہے کہ فلاں شخص پر جن سوار ہے، اس کی کیا حقیقت ہے؟ کیا ابلیس یا شیطان ہر جگہ حاضر و موجود ہے اور ہر انسان تک بیک وقت رسائی رکھتا ہے؟

(۸) گناہ کے دنیوی عواقب اور اُخروی نتائج کے ظہور و لزوم سے آپ نے حیات بعد الممات پر استدلال کیا ہے لیکن توبہ سے گناہوں کا معاف ہو جانا بھی مسلّم ہے۔ ان دونوں میں تضاد محسوس ہوتا ہے، جسے دُور کرنے میں آپ کی مدد کا خواہاں ہوں۔

(۹) غیبت گناہ ہے مگر بعض اوقات کسی انسان کے ایسے اخلاقی معایب بیان کرنے ناگزیر ہوتے ہیں جن سے اس کی سیرت کی تصویر کشی ہو، مثلاً وہ جلد باز ہے، غصیلہ ہے وغیرہ۔ کیا ضرورۃً بھی ایسا نہیں کیا جا سکتا؟

(۱۰) نزولِ مسیحؑ، دجّال اور یاجوج ماجوج کے متعلق جو تفسیر آپ نے بیان کی ہے اور ان کی باہمی کشمکش کا جو ذکر کیا ہے، وہ ایٹمی دَور کے نقشۂ جنگ سے مطابقت نہیں رکھتا۔ موجودہ زمانے میں تو تیز تفنگ کے بجائے ایٹم بم سے دنیا چند منٹ میں تباہ ہو سکتی ہے۔

جواب:۔ میری قوتِ کار چونکہ روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے اور مصروفیتیں بڑھتی جا رہی ہیں، اس لیے مجھے اپنا وقت بڑی کفایت شعاری کے ساتھ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اسی وجہ سے زیادہ تفصیلی جواب طلب خطوط کے جواب دینے میں مجھے بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ تاہم آپ کے سوالات کے مختصر جوابات دے رہا ہوں۔

۱۔ نفس کا لفظ کبھی تو زندہ اشخاص کے لیے بولا جاتا ہے، جیسے فرمایا كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ۔ اور کبھی اس سے مراد MIND یا ذہن ذی شعور ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا۔ کبھی اس سے مراد رُوح ہوتی ہے، جیسے فرمایا وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ (یعنی جب روحیں پھر جسم کے ساتھ ملا دی جائیں گی)۔ کبھی اس سے مراد انسان کی پوری ذات ہوتی ہے مع جسم و روح، جیسے فرمایا وَفِیْ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ؟ (کیا تم خود اپنی ذات یا اپنے وجود پر غور نہیں کرتے؟)۔ کبھی اس سے مراد انسانی ذہن کے اس حصے سے ہوتی ہے جو خواہشات اور جذبات

کا محل ہے، جیسے فرمایا وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنْفُسُ (جنت میں وہ سب کچھ ہوگا جس کی نفس خواہش کریں گے)۔ اور کبھی اس سے مراد ذہنِ انسانی کا وہ حصہ ہوتا ہے جو اپنی قوتِ فیصلہ JUDGEMENT استعمال کر کے یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اسے کس راہ کو اختیار کرنا اور کس طریق کار یا طریقِ زندگی کو اپنانا ہے۔ یہ نفس اگر بُرائی کی راہ پر جانے کا فیصلہ کرتا ہے تو اسے نفس امّارہ کہا جاتا ہے جیسے فرمایا اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ۔ اگر وہ بُرائی کے ارتکاب پر کڑھتا اور ملامت کرتا ہے تو اسے نفس لوامہ (یا جدید اصطلاح میں ضمیر) کہا جاتا ہے، جیسے فرمایا وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ۔ اور اگر وہ راہِ راست کو پورے شرح صدر کے ساتھ اختیار کر کے اس کی تکلیفوں کو صبر و سکون کے ساتھ گوارا کرتا ہے اور اس کے خلاف چلنے کے فوائد کو ٹھکرا کر پچھتانے کے بجائے خوش رہتا ہے تو اسے نفس مطمئنہ کہا جاتا ہے جیسے فرمایا يَآ اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً۔

۲۔ قرآن مجید کی آیت وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ... میں نفس سے مراد ذہنِ ذی شعور ہے جسے سوچنے سمجھنے، رائے قائم کرنے اور انتخاب و فیصلہ کرنے کے لیے ضروری صلاحیتیں عطا کی گئی ہیں اور علم و فہم اور تعقل کے وہ ذرائع بھی بہم پہنچائے گئے ہیں جو ان صلاحیتوں کو استعمال کرنے کے لیے درکار ہیں۔ تسویہ سے مراد کسی چیز کو ٹھیک ٹھیک تیار کر دینے کے ہیں، جیسے موٹر کو اس طرح تیار کر دینا کہ وہ پوری طرح سڑک پر چلنے کے قابل ہو جائے فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر ایک ایسا الہامی (INTUITIVE & INHERENT) علم رکھ دیا ہے جس سے وہ بُرائی اور بھلائی میں تمیز کرتا ہے اور پہچانتا ہے کہ بُرائی کی راہ کونسی ہے اور بھلائی کی کونسی۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا میں نشوونما دینے اور دبانے والے سے مراد انسان کی وہ "انا" یا اس کی وہ خودی SELF یا EGO ہے جو "میرا ذہن"، "میری عقل"، "میرا دل"، "میری روح"، "میری جان"، "میری زندگی" وغیرہ الفاظ بولتی ہے یہی "انا" اس ذہنِ ذی شعور کی مالک بنائی گئی ہے، اس کو یہ ذہن اس لیے دیا گیا ہے کہ وہ اس کی صلاحیتوں اور قوتوں کو استعمال کر کے اپنی اچھی یا بُری شخصیت جیسی بھی چاہے بنائے۔ یہ اگر اس ذہنِ ذی شعور کو صحیح طور پر ترقی دے اور اس کو ٹھیک

طریقے سے استعمال کرے تو فلاح پائے گی، اور اگر وہ نفسِ امّارہ کی غلامی اختیار کر کے ذہن کی ان بہترین صلاحیتوں کو اس فطری راستے پر نہ بڑھنے دے جس پر چلنے کے لیے ہی یہ صلاحیتیں اس میں پیدا کی گئی ہیں اور اس کو زبردستی نفسِ امّارہ کے مطالبات پورے کرنے کے لیے تدبیریں سوچنے اور چالیں چلنے اور طریقے ایجاد کرنے پر مجبور کرے، اور نفسِ لوّامہ کی تنبیہات کو بھی زبردستی دباتی چلی جائے تو یہ نامراد اور ناکام ہو جائے گی۔

۳۔ دماغ ذہن کا محل اور اس کا وہ مادّی آلہ ہے جس کے ذریعہ سے ذہن اپنا کام کرتا ہے۔ اور جسم وہ مشین ہے جو ان احکام کی تعمیل کرتی ہے جو دماغ کے ذریعہ سے ذہن اس کو دیتا ہے۔ اس کو ایک بھدی (CRUDE) مثال کے ذریعہ سے یوں سمجھیے کہ انسان کی ذات گویا مجموعہ ہے ڈرائیور اور موٹر کار کا۔ ڈرائیور ذہن ہے۔ انجن اور اسٹیرنگ ویل میں لگے ہوئے آلات بحیثیت مجموعی دماغ ہیں۔ وہ قوت توانائی جو انجن کے اندر کام کرتی ہے روح ہے۔ اور موٹر کار کی باڈی جسم ہے۔

۴۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاہدے اور صوفیانہ تجربے (MYSTIC EXPERIENCE) کا فرق آپ کو ترجمان میں شائع شدہ سورۂ نجم کی تفسیر سے اور بھی زیادہ واضح طور پر معلوم ہو جائے گا۔ اس سلسلے میں غارِ حرا کے غور و فکر کی نوعیت کے متعلق میں اپنے رسالہ دینیات میں کچھ وضاحت کر چکا ہوں اور آگے تفہیم القرآن میں جب سورہ ضحیٰ اور الم نشرح اور سورۂ اقرأ کی تفسیر آئے گی اس وقت اور زیادہ وضاحت کر دوں گا۔ دراصل غارِ حرا میں حضور کا وہ غور و فکر اس بات پر تھا کہ جاہلیت کے رسوم و عقائد اور مذہبی اعمال تو آپ کو سراسر لغو نظر آتے تھے۔ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) جس مذہب کی نمائندگی کرتے تھے وہ بھی آپ کے ذہن کو اپیل نہیں کرتا تھا پھر آپ کی قوم جن شدید اعتقادی اور اخلاقی و معاشرتی خرابیوں میں مبتلا تھی اسے دیکھ دیکھ کر بھی آپ سخت پریشان ہوتے تھے اور کوئی راہ آپ کو ایسی نہ سوجھتی تھی جس سے آپ دین کی ایک مکمل قابل اطمینان تعبیر بھی پا لیں اور ان خرابیوں کی اصلاح بھی کر سکیں جن میں آپ کو اپنا معاشرہ اور گرد و پیش کی قوموں کا معاشرہ مبتلا نظر آتا تھا۔ اسی کیفیت کو سورہ الم نشرح میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِي أَنْقَضَ ظَهْرَكَ (ہم نے تمہارے دل کا

وہ بوجھ دُور کر دیا جو تمہاری کمر توڑے ڈال رہا تھا)۔ اور اسی کیفیت کو سورہ والضحیٰ میں یُوں فرمایا گیا کہ وَوَجَدَکَ ضَالًّا فَهَدٰی (تمہارے رب نے تم کو ناواقفِ راہ پایا اور تمہیں راستہ بتایا)۔ ضال عربی زبان میں اس شخص کو کہتے ہیں جو راستہ نہ جاننے کی وجہ سے حیران کھڑا ہو اور اس پریشانی میں مبتلا ہو کہ کدھر جاؤں۔

۵۔ آپ سے اس سائیکیٹرسٹ نے جو کچھ کہا ہے وہ بیچارہ اپنے فن کے اندر اس مشاہدے اور اس نورِ علم کی کوئی اور توجیہ نہیں پا سکتا جو نبی کو نصیب ہوتا ہے۔ سائیکلوجی خدا کے بغیر نفس انسانی کے معمّے کو حل کرنا چاہتی ہے۔ اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کنجی کے بغیر قفل کھولنا چاہے۔ اسے اگر قرآن کو سمجھ کر پڑھنے کی توفیق ہوتی تو وہ اپنی سائیکیٹری کے فن میں اس امر کی کوئی توجیہ نہ پا سکتا کہ ایک سائیکوٹک (PSYCHOTIC) کا نفسیاتی تجربہ آخر قرآن جیسی کتاب اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی لیڈرشپ جیسی کمال درجہ جامع، متوازن اور لازوال (EVERLASTING) قیادت کیسے لا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ معاملہ سائیکیٹری کے فن کے حدود سے بالاتر اور وسیع تر نوعیت کا ہے۔ آدمی اگر بے لاگ غیر متعصب اور ضد سے پاک ہو تو وہ اسے سائیکیٹری کی گرفت میں لانے کی کوشش کرنے کے بجائے اپنے فن کی کوتاہی کا اعتراف کرے گا۔ اس قفل کی کنجی اسے کبھی نہیں مل سکتی جب تک وہ اس بات کو نہ مانے کہ ایک خدا ہے، اور انسان کو اسی نے زمین میں پیدا کیا ہے، اور اسی نے یہ ذمہ لیا ہے کہ نوعِ انسانی کی رہنمائی کا انتظام خود انسانوں ہی میں سے بعض افراد کے ذریعہ سے کرے، اور نبی کو وہی اس غرض کے لیے کچھ مشاہدے کراتا ہے اور ایک خاص طریقے سے اس کو علم دیتا ہے۔ اس بات کو جانے بغیر نبی کے مشاہدے اور الہام کی یہ احمقانہ تعبیر کہ وہ نعوذ باللہ ایک ذہنی علالت کا نفسیاتی تجربہ تھا، کوئی کر بھی دے تو کیا وہ اپنی سائیکیٹری کے پُورے علم سے کسی ایسے نفسیاتی مریض کی کوئی نظیر لا سکتا ہے جس نے فریبِ نظر و تخیل (HALLUCINATION) کی حالت میں قرآن جیسی ایک کتاب تیار کر دی ہو اور پھر اسے لے کر وہ دنیا کی رہنمائی کے لیے اٹھا ہو اور اس نے نہ صرف ایک قوم کی زندگی میں بلکہ نوعِ انسانی کے ایک بہت بڑے حصّے کی زندگی میں ایسا ہمہ گیر انقلاب برپا کر دیا ہو۔

۶ - اسلام نے تاریخ مذہب کا یہ تصور جو پیش کیا ہے کہ نوع انسانی کا آغاز علم کی روشنی میں ہوا ہے اور نوع انسانی کا ابتدائی دین توحید تھا اور شرک اس کے بعد آیا ہے، اس کی تردید موجودہ علم الآثار (آرکیالوجی) اور علم الانسان (ANTHROPOLOCY) سے نہیں ہو سکتی - اس لیے کہ اسلام جس دور کا ذکر کرتا ہے وہ زمانۂ قبل از تاریخ ہے اور یہ دونوں علم ابھی تک دورِ تاریخ ہی میں گھوم رہے ہیں - نہ آثار قدیمہ کا علم ابھی انسان کی بالکل ابتدائی حالت تک رسائی پا سکا ہے، اور نہ قبائلِ قدیمہ ABORIGINAL TRIBES کے متعلق یہ دعویٰ صحیح ہے کہ ان قبائل کی زندگی لازماً ابتدائی انسان کی مکمل اور صحیح نمائندہ ہے - یہ محض قیاسات ہیں جن کو خواہ مخواہ "علم" قرار دینے کی کوشش کی جاتی ہے -

۷ - موجودہ سائیکیٹری ہی نہیں، بلکہ موجودہ قانونی اور عمرانی فکر کا سارا رجحان مجرم کی حمایت اور جرائم کے ساتھ رعایت کی طرف جا رہا ہے - جن لوگوں کی زندگی مجرمین کے افعال کی شکار ہوتی ہے ان کے ساتھ ہمدردی روز بروز کم ہو رہی ہے اور مجرموں کو سزا دینے پر ان لوگوں کا دل کچھ زیادہ ہی دکھتا چلا جا رہا ہے - یہی وہ اصل محرک ہے جس کی بنا پر یہ فلسفے بھگارے جا رہے ہیں کہ مجرمین دراصل بیمار ہیں، نہ کہ دانستہ ارتکابِ جرم کرنے والے سماج دشمن (ANTI SOCIAL) لوگ - سوال یہ ہے کہ اس فلسفے کے تحت کیا آپ کی سائیکیٹری جرائم کو روکنے یا ان کو کم کرنے میں آج تک کامیاب ہوئی ہے؟ بلکہ میں پوچھتا ہوں کہ جرائم کی روز افزوں ترقی کی رفتار کو یہ لوگ کسی حد کے اندر بھی رکھ سکے ہیں؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو اسلامی فقہ کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ ان فلسفوں سے خواہ مخواہ مرعوب ہو کر اپنی پوزیشن پر نظر ثانی کرے؟

۸ - جنوں کے بارے میں قرآن و حدیث میں کہیں بھی یہ نہیں کہا گیا ہے کہ ان کو خلافت دی گئی ہے - البتہ یہ کہا گیا ہے کہ انسان کی طرح جن بھی ایک ذمہ دار مخلوق ہے جس کو کفر و ایمان اور طاعت و معصیت کی آزادی حاصل ہے - اسی طرح قرآن و حدیث سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ جن انسان کے جسم و ذہن پر قبضہ کر سکتا ہے - البتہ یہ کہا گیا ہے کہ شیاطین جن انسان کے نفسِ امارہ سے کسی غیر محسوس طریقہ پر رابطہ قائم کر کے اسے گمراہی کی ترغیب دیتے ہیں - نیز قرآن و حدیث میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ ابلیس ہر جگہ حاضر و ناظر ہے بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ ہر انسان کے ساتھ شیاطینِ جن میں سے ایک شیطان لگا ہوا ہے جو اسے گمراہ کرنے کی کوشش

کرتا ہے۔ ابلیس ہر انسان کے پاس ہر جگہ نہیں جاتا، بلکہ وہ ان شیاطین کا لیڈر ہے۔ شاید وہ بڑے بڑے لیڈروں ہی کے پاس جاتا ہوگا۔

۹۔ آخرت کے سلسلے میں جو استدلال میں نے کیا ہے، اس میں اور توبہ کے تصور میں درحقیقت کوئی تضاد نہیں ہے۔ انسان جو جرائم کرتا ہے ان کے اثرات اس کی اپنی ذات پر بھی پڑتے ہیں اور معاشرے میں بھی دُور دُور تک پھیلتے ہیں، حتیٰ کہ مجرم کے مرنے کے بعد بھی ان کا سلسلہ زمانہ دراز تک چلتا ہے۔ اگر وہ توبہ نہ کرے اور مرتے دم تک اپنے انہی افعال کو جاری رکھے تو لازماً اسے اللہ کے محاسبے اور سزا سے دوچار ہونا پڑے گا۔ لیکن اگر وہ توبہ کرلے اور اپنی اصلاح کرنے کی مخلصانہ کوشش کرے تو اللہ تعالیٰ اسے محاسبے اور سزا سے معاف کردے گا اور جن لوگوں کو اس کے سابق جرائم سے نقصان پہنچا ہے ان کے نقصان کی تلافی کسی اور طریقہ سے فرما دے گا۔ توبہ سے معافی کا دروازہ اگر بند ہو تو جو شخص ایک دفعہ اخلاقی پستی میں گر چکا ہو اس کے لیے تو پھر مایوسی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یہ مایوسی اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نہ صرف اس پستی میں مبتلا رکھے گی بلکہ اور زیادہ پستیوں کی طرف گراتی چلی جائے گی۔

۱۰۔ غیبت کے متعلق بہت مفصل بحث میری کتاب "تفہیمات" حصہ سوم میں موجود ہے۔ اسے آپ پڑھ لیں گے تو آپ کو اس کی جائز اور ناجائز نوعیتوں کا فرق اچھی طرح معلوم ہو جائے گا۔

۱۱۔ یاجوج و ماجوج، خروجِ دجّال اور نزولِ عیسیٰ علیہ السّلام کے متعلق جو سوال آپ نے کیا ہے اس کے متعلق میں کوئی مفصل جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ آئندہ دنیا میں کیا ہونے والا ہے۔ مستقبل کے متعلق جتنا کچھ قرآن و حدیث سے میں سمجھ سکا ہوں اُسے میں نے تفہیم القرآن اور رسالہ ختمِ نبوت میں بیان کر دیا ہے۔ لیکن تفصیلات جاننے کا کوئی ذریعہ میرے پاس نہیں ہے۔ ایٹم کی موجودگی میں بھی قدیم اسلحہ کا استعمال غیر ضروری نہیں ہو جاتا اور دست بدست لڑائی کی نوبت بھی آسکتی ہے۔

کیا "نُور" اور "کتابِ مُبین" ایک شے ہے؟

سوال: "تفہیم القرآن" کے مطالعہ سے دل کو سکون اور ذہن کو اطمینان ہوتا ہے لیکن سورۂ مائدہ رکوع سوم آیت ۱۵ (تفہیم القرآن حصہ اوّل) میں قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ کا ترجمہ و تفسیر کرتے وقت آپ سے ایک ایسی غلطی سرزد ہوئی ہے جس سے ایک گروہ کو اپنے مفید مطلب مواد ملنے اور دوسرے گروہ کو آپ کی علمیت پر انگشت نمائی کا موقع حاصل ہونے کا پُورا امکان ہے۔ آپ نے آیت کے اس حصہ کا ترجمہ یُوں فرمایا ہے:

"تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی آگئی ہے اور ایک ایسی حق نما کتاب (جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو جو اُس کی رضا کے طالب ہیں سلامتی کے طریقے بتاتا ہے ...)۔

اِس ترجمہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ "روشنی" کو ایک الگ شے اور "حق نما کتاب" کو بالکل دوسری چیز سمجھتے ہیں ——— اسی کے حاشیہ (نمبر ۳۸) سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کیوں کہ آپ نے وہاں تحریر فرمایا ہے:

"جو شخص اللہ کی کتاب اور اُس کے رسول کی زندگی سے روشنی حاصل کرتا ہے"۔ گویا آپ "نُور" سے رسولِ کریم کی ذات یا ان کی زندگی اور "کتابِ مُبین" سے قرآن مجید مراد لے رہے ہیں۔ حالانکہ اگلی آیت کا دوسرا لفظ بِهٖ (اللہ) صاف بتا رہا ہے کہ اِن دونوں (نُور اور کتابِ مُبین) سے مُراد ایک چیز ہے، دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ اگر دو الگ ہوتیں تو بِهٖ کی جگہ بِهِمَا آتا جیسا کہ آپ کا ترجمہ خود بتا رہا ہے: "جس کے ذریعہ (نہ کہ جن کے ذریعہ) سے اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو ....

رہا یہ سوال کہ دونوں اگر ایک ہی چیز ہیں تو وہ چیز کیا ہے؟ ——— رسول یا قرآن مجید؟ ——— یہ تو آپ بھی تسلیم فرمائیں گے کہ رسول اکرمؐ کو سارے قرآن میں نہ کہیں "نور" کہا گیا ہے اور نہ "کتابِ مبین"! البتہ قرآن کریم کو کئی مقامات پر (مثلاً سورۂ نساء آیت ۱۷۴، سورۂ

الاعراف آیت ۱۵۷، سورۂ شوریٰ آیت ۵۲ اور سورۂ تغابن آیت ۸) نور سے یاد کیا گیا ہے اور "کتابِ مبین" تو وہ ہے ہی۔

اب یہ سوال ہے "نور" اور "کتابِ مبین" کے درمیان جو "واؤ" ہے وہ کیسی ہے؟ اور اس کا مفہوم اگر "اور" نہیں ہے تو کیا ہے؟ یقیناً "واؤ" عاطفہ بھی ہوتی ہے جس کا مطلب "اور" ہوتا ہے۔ لیکن "واؤ" تفسیری اور توضیحی بھی ہوتی ہے اور قرآن کریم میں متعدد مقامات پر استعمال ہوئی ہے۔ یہ تو آپ کو علم ہی ہے کہ قرآن اپنی تفسیر آپ بھی کرتا ہے۔ مثال کے طور پر سورہ الحجر آیت ۱:

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ

ترجمہ: یہ کتاب یعنی واضح قرآن کی آیات ہیں۔

کیا یہ ترجمہ ٹھیک ہوگا: "الٓرٰ، یہ کتاب اور قرآن واضح کی آیات ہیں"؟ (حالانکہ کتاب اور واضح قرآن ایک چیز ہیں)

اسی طرح سورہ "نمل" کی ابتدائی آیت:

طٰسٓ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتٰبٍ مُّبِيْنٍ

ترجمہ: طٰسٓ، یہ قرآن یعنی ایک واضح کتاب کی آیتیں ہیں۔

طٰسٓ "یہ قرآن اور ایک کتاب واضح کی آیتیں ہیں" کے ترجمہ سے شک پڑتا ہے کہ شاید قرآن اور شے ہو اور کتاب واضح، اور چیز! حالانکہ قرآن اور کتاب واضح ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ "واؤ" تشریح اور تفسیر کے لیے (یعنی کے معنوں میں) بھی استعمال ہوتی ہے۔ آیت زیرِ نظر (قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ) میں بھی "واؤ" توضیحی و تفسیری ہی ہے۔

آپ کا ترجمہ دراصل یوں ہونا چاہیے تھا:

"تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی یعنی ایک ایسی حق نما کتاب آگئی ہے جس کے ذریعے..."

اور تشریحی نوٹ (حاشیہ نمبر ۳۸) یوں ہوتا تو درست ہوتا: "... جو شخص اللہ کی کتاب سے روشنی حاصل کرتا ہے اُسے فکر و عمل ..."

رہا رسول کا ذکر تو وہ اسی آیت کے پہلے حصہ میں "یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ قَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلُنَا ... عَنْ کَثِیْرٍ ط کے الفاظ میں ہو چکا ہے۔

متاخرین میں مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اپنی تفسیر "بیان القرآن" میں اسی حصہ کا ترجمہ "تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی ہے اور (وہ) ایک کتاب واضح (ہے یعنی قرآن مجید ...) اس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ..." کیا ہے۔

انہی کے شاگرد مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے اپنی انگریزی تفسیر میں اسی مقام پر "مبین" کی تشریح میں جو کچھ لکھا ہے اس کا ترجمہ یہ ہے:

"مبین سے اشارہ نکلتا ہے کہ قرآن مجید نہ صرف فی نفسہٖ نور ہے بلکہ یہ دوسری اشیاء کو بھی واضح اور روشن بنا دیتا ہے"

امید ہے آپ ان گزارشات کی روشنی میں "تفہیم القرآن" کے اس حصہ پر نظر ثانی فرمائیں گے تاکہ ایک فریق کو اپنے غلط عقائد کے لیے غذا اور فریق دیگر کو تنقید کا موقع میسر نہ آسکے۔"

جواب - آپ کا خط ملا۔ آیت قَدْ جَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ وَّکِتٰبٌ مُّبِیْنٌ کا جو ترجمہ میں نے کیا ہے اس سے پہلے متعدد مترجمین بھی وہی ترجمہ کر چکے ہیں، اور اس کی تفسیر میں بھی میں منفرد نہیں ہوں، بلکہ متعدد اکابر مفسرین نے بھی اس کی یہی تفسیر کی ہے۔ پہلے چند اردو تراجم ملاحظہ کیجیے:

شاہ ولی اللہ صاحب کا ترجمہ: آمد بشما از جانب خدا نورے و کتابے روشن یعنی قرآن

شاہ رفیع الدین صاحب ،، : آئی تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی اور کتاب بیان کرنے والی۔

شاہ عبدالقادر صاحب ،، : تم پاس آئی ہے اللہ کی طرف سے روشنی اور کتاب بیان کرتی۔

مولانا محمود الحسن صاحب ،، : بے شک تمہارے پاس آئی ہے اللہ کی طرف سے روشنی اور کتاب ظاہر کرنے والی۔

یہ تو ہیں پچھلے بزرگوں کے ترجمے۔ اب ذرا اکابر مفسرین کی تفسیریں بھی ملاحظہ ہوں:

ابن جریر نور کی تفسیر کرتے ہیں: یعنی بالنور محمداً صلی اللہ علیہ وسلم الذی انار اللہ بہ الحق واظھر بہ الاسلام ومحق بہ الشرک۔ (نور سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کے ذریعے سے اللہ نے حق کو روشن کیا، اسلام کو غالب فرمایا اور شرک کو مٹا دیا)۔

امام رازی لکھتے ہیں: فیہ اقوال، الاول ان المراد بالنور محمد وبالکتاب القرآن۔ والثانی ان المراد بالنور الاسلام وبالکتاب القرآن۔ والثالث النور والکتاب ھو القرآن وھذا ضعیف لان العطف یوجب المغایرۃ بین المعطوف والمعطوف علیہ۔ (اس آیت کی تفسیر میں متعدد اقوال ہیں۔ ایک یہ کہ نور سے مراد محمدؐ ہیں اور کتاب سے قرآن۔ دوسرا قول یہ ہے کہ نور سے مراد اسلام اور کتاب سے مراد قرآن ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ نور اور کتاب سے مراد قرآن ہی ہے مگر یہ قول کمزور ہے کیونکہ عطف میں لازم ہے کہ معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان مغایرت ہو)

علامہ آلوسی نے بھی اسی تفسیر کو ترجیح دی ہے کہ نور سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔

مولانا شبیر احمد صاحب نے اگرچہ یہ بات کہ نور سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، لفظ شاید کے ساتھ لکھی ہے، لیکن اس کے سوا کوئی دوسری تفسیر انہوں نے بیان نہیں کی ہے۔ اس لیے معلوم یہی ہوتا ہے کہ وہ بھی اسی تفسیر کو ترجیح دیتے ہیں، مگر "شاید" کا لفظ انہوں نے اس بنا پر لکھا ہے کہ قرآن میں نور سے مراد حضورؐ کی ذات ہونے کی تصریح نہیں ہے۔

آپ نے اس تفسیر پر جو اشکال یَھْدِیْ بِہٖ کی ضمیر واحد سے وارد کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ قرآن مجید میں اس امر کی متعدد نظیریں موجود ہیں کہ واؤ عطف کے ساتھ دو الگ ہستیوں کا ذکر کرنے کے بعد صیغۂ واحد استعمال کیا گیا ہے اور وہاں واؤ کو عطفِ تفسیر کے معنی میں لینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ نور میں فرمایا: وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ لِیَحْکُمَ بَیْنَھُمْ (آیت ۴۸) کیا یہاں آپ واؤ کو تفسیر کے معنی میں لیں گے؟ درحقیقت ایسے مواقع پر ضمیر واحد اس وجہ سے استعمال کی جاتی ہے کہ دونوں حکم میں ایک ہوتے ہیں۔ اللہ کا حکم اور رسول کا حکم دو الگ چیزیں نہیں بلکہ ایک ہی حکم ہے

جو اللہ اور رسول دیتے ہیں۔ دونوں میں تخالف ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح کتاب کی ہدایت اور رسول کی ہدایت دونوں جُدا جُدا نہیں ہیں بلکہ دونوں ایک ہی ہدایت دیتے ہیں۔

باقی رہا آپ کا یہ خیال کہ اس تفسیر سے بعض لوگ غلط استدلال کر سکتے ہیں، تو اس کے متعلق میں یہ عرض کروں گا کہ اصل گمراہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو نورِ ہدایت قرار دینا نہیں ہے بلکہ آپ کی بشریّت کا انکار ہے۔ آپ کے لیے محض لفظ نور کے استعمال سے اگر کوئی شخص یہ استدلال کرتا ہے کہ آپ بشر نہ تھے کیونکہ قرآن میں آپ کو "نور" کہا گیا ہے، تو وہ آخر اس بات کا کیا جواب دے گا کہ قرآن میں تو آپ کو سراج منیر (روشنی دینے والا چراغ) بھی کہا گیا ہے، پھر کیا اس سے یہ لازم آئیگا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بشر نہ تھے بلکہ ایک "چراغ" تھے۔

خلافت و ملوکیّت

سوال: "میں نے جناب کی "خلافت و ملوکیّت" اور عباسی صاحب کی جوابی کتاب "تبصرہ محمودی"، حصہ اوّل و دوم کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا اور میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ عباسی صاحب اسلام کے سیاسی نظام کا کوئی واضح تصوّر نہیں رکھتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اسلام کا جو سیاسی نظریہ پیش فرمایا ہے وہ ذہنی پیچیدگی کا شاہکار ہے البتہ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ جناب چند باتوں کی وضاحت کر دیں تو آپ کے خلاف پروپیگنڈا اعلیٰ طبقہ میں مؤثر نہ ہو سکے گا۔ وضاحت طلب امور یہ ہیں: عباسی صاحب کا کہنا ہے کہ اسلام میں کوئی طریقۂ انتخاب برائے خلیفہ معیّن نہیں ہے اس لیے کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں عوام کا اجتماع نہ تھا بلکہ چند افراد جس میں تمام طبقوں کی نمائندگی بھی نہ تھی جمع ہوئے اس لیے یہاں عوامی رائے یا تائید کا کوئی سوال نہیں تھا۔

حضرت عمرؓ کے معاملہ میں آپ کو حضرت ابوبکرؓ نے نامزد کر دیا اور سب نے

اس نامزدگی پر اتفاق کر لیا رائے عامہ کے اظہار کا یہاں بھی کوئی سوال نہیں آیا۔ پھر عباسی صاحب کہتے ہیں کہ اگر رائے عامہ کے اصول کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو بیعت تو صرف مدینہ میں ہوئی تھی۔ پورے ملک میں رائے عامہ یا مسلمانوں کی رضامندی کا سوال یہاں بھی خارج از بحث ہو جاتا ہے۔

اس کے علاوہ عباسی صاحب معترض ہیں کہ اگر حضرت معاویہ کی حکومت ملوکیت تھی تو اجتماعِ صحابہ نے اس کی تائید و بیعت کیوں کی اور ان کی حکومت میں عہدے کیوں قبول کیے ؟

مزید برآں عباسی صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ تاریخ کو اسی طرح جانچنا چاہیے جس طرح حدیث کو فنِ رجال کی بنیاد پر جانچا جاتا ہے۔

جواب : عباسی صاحب کی جن تین باتوں کا ذکر آپ نے کیا ہے، ان کا جواب میری کتاب خلافت و ملوکیت میں موجود ہے۔

۱۔ طریق انتخاب کے بارے میں ملاحظہ ہو صفحہ ۳۵-۳۶-۷۰-۷۳ تا ۷۵-۸۳ تا ۸۷-۵۷ تا ۱۶۰-۲۴۹-۲۵۰

۲۔ اس سوال کا جواب کہ اگر حضرت معاویہؓ کی حکومت ملوکیت تھی تو صحابہ نے ان کی بیعت کیوں کی اور ان کی حکومت میں عہدے کیوں قبول کیے، حسبِ ذیل صفحات پر ملاحظہ ہو : ۱۵۸، ۲۰۱ تا ۲۰۲-۲۵۱ تا ۲۵۴-

۳۔ آخری سوال کا ایک جواب تو میری کتاب میں صفحات ۳۱۶ تا ۳۱۸ پر موجود ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ عباسی صاحب خود جس تاریخی مواد پر اعتماد کر کے تاریخی حالات و واقعات بیان کرتے ہیں وہ بھی ان کے اپنے بیان کردہ معیار پر پورا نہیں اترتا۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ اس شرط کے ساتھ اگر تاریخ لکھی جائے تو بعد کی صدیوں کا تو کیا ذکر، پہلی صدی کی تاریخ کا بھی ۹/۱۰ حصہ غائب ہو جاتا ہے اور یہ معاملہ تو اسلامی تاریخ کے ساتھ ہوگا۔ رہی دنیا کی عام تاریخ، تو وہ ساری کی ساری ہی دریا برد کرنی پڑیگی، کیونکہ اس میں تو سند اور رجال کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔